خواجہ حسن نظامی

ولادت: ۱۸۷۸ء | وفات: ۱۹۵۵ء

خواجہ حسن نظامی کا پورا نام سید علی حسن نظامی تھا جب کہ علامہ اقبال نے اُنھیں خواجہ حسن نظامی کا نام دیا اور وہ اسی نام سے مقبول ہوئے۔ اُن کی ولادت دہلی سے تین میل دور بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں ہوئی۔ ابھی خواجہ صاحب کی عمر صرف گیارہ برس تھی کہ اُن کے سر سے ماں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ بڑے بھائی نے اُن کی پرورش کی۔ خواجہ صاحب نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں تصوف کی حکمرانی تھی۔ اُنھوں نے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ تصوف کی تعلیم بھی حاصل کی۔ منشی غلام نظام الدین (تاجرِ کتب دہلی) کے فیضِ صحبت سے اُن میں ادبی ذوق اور صحافتی میلان پیدا ہوا۔ اُنھوں نے پہلا مضمون ''انڈیا کی نازک حالت'' کے عنوان سے لکھا۔ پھر کچھ عرصے تک ''پیسہ''، ''وکیل'' اور ''مخزن'' نامی رسائل کے لیے لکھتے رہے۔ ''حلقۂ نظام المشائخ'' کے مقاصد کی ترویج کے لیے <u>۱۹۱۱ء</u> میں اُنھوں نے مصر، شام فلسطین، عرب اور دیگر اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ <u>۱۹۱۹ء</u> میں ''نظام المشائخ'' کے عنوان سے پہلا ماہنامہ رسالہ جاری کیا۔ اُنھوں نے مختلف اوقات میں چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں اور رسالے تصنیف کیے۔

خواجہ صاحب کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا اس لیے ایک مقصد کو سامنے رکھ کر اُنھوں نے سادہ، آسان اور عام فہم زبان میں تصوف کے اسرار و رموز کو عام لوگوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اُنھوں نے ایسا دلکش طرزِ تحریر اور پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ خشک اور بے کیف اخلاقی اور روحانی مباحث تصوف اور فلسفے سے نکل کر ادب میں داخل ہو گئے۔ اُن کے مضامین کے مقبول ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے

سب سے الگ طرز اختیار کیا۔ جو کچھ لکھا سیدھے سادے اور عام پیرائے میں لکھا، عوام کے لیے لکھا اور ان موضوعات پر لکھا جن پر انسان کی طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے۔ انشا پردازی کے معاملے میں اُنھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ وہ انشا پردازی میں عربی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے کے خلاف تھے۔ وہ اپنی بات سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں کہتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے گرد و نواح میں جو کچھ دیکھا من و عن بیان کیا، اُن کے ہاں کہیں بھی تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔

تصانیف: بیگمات کے آنسو، سیپارۂ دل، دہلی کی آخری شمع، بہادر شاہ کا روزنامچہ، دہلی کی سزا، سفرنامۂ حجاز و مصر و شام، جگ بیتی کہانیاں، انگریزوں کی بپتا، محرم نامہ، طمانچہ بر رخسارِ یزید وغیرہ۔

فاقہ میں روزہ

(دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ)

جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی، لال قلعہ پر تیموریوں کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ انھیں دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابوظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ مرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد مغموم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا: خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔ مرزا نے مسکرا کر جواب دیا: نہیں کچھ نہیں، بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہوجاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت تحسن خاں گویا گا رہا تھا اور مرا دل بہلا رہا تھا۔ اس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں، ان کو یہ شوروغل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان میں گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا، مگر اس کی پابندی سے جی الجھتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیوں کر بسر ہوں گے۔

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: حضور یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے۔ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد میں تشریف لے چلا کیجیے، عجب بہار ہوتی ہے۔ رنگ برنگ کے آدمی، طرح طرح کے جمگھٹے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہیں خدا والوں کی بہار بھی دیکھیے۔

مرزا نے اس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں۔ کہیں قرآن شریف کے دور ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سنانے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں مسائل دین پر گفتگو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور بیسیوں آدمی بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے۔ کہیں کوئی صاحب وظائف میں مشغول ہیں۔ الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔

"کُلُّ جَدِیْدٌ لَذِیْذٌ" مرزا کو یہ نظام بہت پسند آیا اور وقت بہت لطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا۔ سیکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محلِ سلطانی سے متعدد خوان، مکلف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب امراء علیحدہ افطاری کے سامان بھیجتے تھے۔ اس لیے ان خوانوں کی گنتی سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی اور مسجد میں ان کی عجب آرائش ہوجاتی تھی۔

مرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان وشوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھروں میں وہ دیکھتے کہ سیکڑوں فقرا کو سحری اور اول شب کا کھانا، روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوایا جاتا تھا۔

(مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نو عمری کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔) ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیر و زبر ہوگئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا۔ ان کے گھر اکھڑ گئے۔ ان کی بیگمات ماما گیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان وشوکت تاراج ہوگئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولھے بنے ہوئے ہیں۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں۔ گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہجہاں کی خوب صورت اور بے مثل مسجد اصطبل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجد واگذاشت ہوگئی اور سرکار نے اُس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا، تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا

ہوا۔ دیکھا کہ چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ دو چار قرآن شریف کا دور کر رہے ہیں اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیے، کسی نے ترکاری کے قتلے تقسیم کردیے۔ نہ وہ اگلا سا سماں، نہ وہ اگلی سی چہل پہل، نہ وہ پہلے کی سی شان و شوکت، یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد آج کل کا زمانہ بھی دیکھا، جبکہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان، مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غرباء آئے، تو ان سے رونق کیا خاک ہوسکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد ہے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے غدر کا قصہ اور تباہی کا فسانہ سننا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اس کے بیان کرنے میں عذر و مجبوری ظاہر کرنے لگے۔ لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اس طرح سنائی:

جب انگریزی توپوں اور سنگینوں نے ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی، تاج سر سے اتار لیا، تخت پر قبضہ کرلیا۔ شہر میں آتشناک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں، بے چادر ہوکر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ چھوٹے، بن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یارومددگار پھرنے لگے۔ حضور ظل سبحانی، جن پر ہم سب کا سہارا تھا، قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کمسن بہن اور بیوی کو ساتھ لے کر اور اجڑے قافلہ کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رخ کیا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولان گاہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے شاہدرہ سے واپس ہوکر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔

چھترپور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا، مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق و دق جنگل، تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی ایک بڑھاپے سے دوچار، دو قدم چلنا دشوار، دوسری بیمار، تیسری دس برس کی معصوم لڑکی، زار وقطار عورتیں روتی تھیں اور بین کرکر کے روتی تھیں۔ میرا

کلیجہ ان کے بین سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں الٰہی! ہم کہاں جائیں؟ کس کا سہارا ڈھونڈیں؟ ہمارا تاج وتخت لٹ گیا، تو ٹوٹا بوریا اور امن کی جگہ تو دے، اس بیمار کو کہاں لے کر بیٹھوں، اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں، جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں، کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منہ تکتی تھی۔ مجھ کو اس کی معصومانہ بے کسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آیا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب یہ کہتیں:

''تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کردیا، جو بیکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں، جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنادی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے، آج ہم پر آسمان روتا ہے''۔

تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ القصہ بہ ہزار دقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے (یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا۔ انھوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی چوپاڑ میں کچھ روز ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرائے رکھا) لیکن کب تک یہ بار اٹھا سکتے تھے، اکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میاں جی! چوپاڑ ایک برات آنے والی ہے تُو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن ٹھالی (بیکار) بیٹھے کیا کرے ہے، کچھ کام کیوں نہیں کرتا؟ میں نے کہا: بھائی جہاں تم کہو گے وہیں جا پڑیں گے، ہمیں چوپاڑوں میں رہنے کی ہوس نہیں، جب فلک نے عالیشان محل چھین لیے، تو اس کچے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے اور رہی کام کرنے کی بات سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے، خالی بیٹھے ہوئے طبیعت اکتائی جاتی ہے، مجھ کو کوئی کام بتاؤ۔ ہوسکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔ ان کا چودھری بولا: ہم نے کے بیرا

(ہمیں کیا خبر) کہ تو کے کام (کیا کام) کرسکے ہے۔ میں نے جواب دیا: میں سپاہی زادہ تیغ، تفنگ چلانا میرا ہنر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔ گنوار ہنس کر کہنے لگے: نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا، گھاس کھودنی پڑے گی، ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں۔ گنواروں کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور جواب دیا کہ بھائیو! مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔ مجھ کو روتا دیکھ کر گنواروں کو رحم آگیا اور بولے: اچھا تُو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج دے دیا کریں گے، جو تجھ کو برس دن کو کافی ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینا آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا، میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دبایا۔ وہ گاؤں، وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر۔ خود لوٹ پوٹ کر اچھے ہوجاتے تھے۔ مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہوگیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہوگئی۔ چونکہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا اس لیے ہماری عورتوں کی چارپائیاں بالکل غرق آب ہوگئیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلیوں میں دو چارپائیاں اڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اتر گیا، مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔

پچھلی رات میری بیوی کے جاڑے سے بخار آیا۔ اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ، مینہ کی جھڑی، کپڑے سب گیلے، آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے الٰہی! کیا انتظام کیا جائے۔ مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہوگئی۔ یہاں تک کہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔

چونکہ وہ ساری عمر نازو نعمت میں پلی تھیں، غدر کی مصیبتیں ہی ان کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں۔ خیر اس وقت تو جان بچ گئی، مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا برا لگا کہ جان لے کر گیا۔ صبح ہوگئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی، تو انھوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گور غریباں میں ہمیشہ کے لیے جاسوئی۔

اب ہم کو کھانے کی فکر ہوئی کیونکہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا۔ گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اسی مصیبت میں گرفتار تھے۔

تاہم ہمارے گاؤں کے چودھری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک روپیہ کا آٹا منگوادیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا۔ والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک تھا، وہ ہروقت گزشتہ زمانہ کو یاد کیا کرتی تھیں، رمضان کا چاند دیکھ کر انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہوگئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو اگلا وقت یاد آگیا ہے۔ تسلی کی باتیں کرنے لگا، جس سے ان کو کچھ ڈھارس ہوگئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گزر گئے، مگر جب آٹا ختم ہوچکا، تو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا، بھوک کے مارے کلیجا منھ کو آتا تھا۔ والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اس قسم کی تکلیف کے وقت بین کرکے رویا کرتی تھیں، مگر آج بڑے اطمینان سے خاموش تھیں، ان کی خاموشی واطمینان سے میرے دل کو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو، جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اڑ رہی تھیں، دلاسا دینے لگا۔ وہ معصوم بھی میرے سمجھانے سے نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سوگئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے بس ایک غوطہ سا تھا۔

اس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آگیا۔ والدہ صاحبہ اٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد، جن دردناک الفاظ میں انھوں نے دعا مانگی، ان کی نقل کرنا محال ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بارگاہ الٰہی! میں عرض کیا کہ:

”ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے گھر سے سیکڑوں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزہ پر روزہ رکھتے ہیں۔ خداوندا! اگر ہم سے قصور ہُوا ہے، تو اس معصوم بچی نے کیا خطا کی؟ جس کے منھ میں کل سے ایک کھیل اڑ کر نہیں گئی“۔

دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور فاقہ میں روزہ پر روزہ رکھا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا: آج ہمارے نیاز تھی، یہ اس کا کھانا ہے اور پانچ روپیہ زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ دیا کرتے ہیں مگر اب کے نقد دے دیا ہے۔

یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئی گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصّہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکرانہ بھیجتا جاتا تھا، مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردشِ فلاکت نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈال دیا، لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیمی غیرت داری پر قائم ہے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے انھوں نے تیور بدل کر کہا: تُف ہے تیری غیرت پر، خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مرجانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے، مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مرجانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے، صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینا آگیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ چاہا کہ اٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں، مگر والدہ نے روکا اور کہا: خدا ہی کو یہ منظور ہے، تو ہم کیا کریں، سب کچھ سہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے مل کر کھالیا۔ پانچ روپے کا آٹا منگوالیا جس سے رمضان خیر و خوبی سے بسر ہوگیا۔

اس کے بعد چھ مہینے گاؤں میں اور رہے، پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا انتقال ہوگیا اور بہن کی شادی کردی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے، جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔ (بیگمات کے آنسو)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) مرزا سلیم والدہ کی باتوں سے کیوں آزردہ تھا؟

(ب) مغلیہ دور میں رمضان میں جامع مسجد میں کیا سماں ہوتا تھا؟ 19 .P

(ج) ۱۸۵۷ء کے بعد رمضان میں جامع مسجد کی کیا حالت تھی؟ 19 .P

(د) مرزا شہ زور کون تھے؟ 19 .P

(ہ) میواتیوں نے مرزا شہ زور کے خاندان سے کیسا برتاو کیا؟ 21 .P

۲۔ خالی جگہ پُر کریں:

(الف) مرزا سلیم ___رمضان___ میں گانے بجانے کی محفلیں سجاتے۔

(ب) مصاحب کے کہنے پر مرزا سلیم ________ جانے لگے۔

(ج) مرزا شہ زور کی والدہ مرزا سلیم کی ________ تھی۔

(د) انگریز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو ________ کہتے ہیں۔

(ہ) ________ نے مرزا شہ زور اور اُس کے خاندان کا سارا مال و اسباب لُوٹ لیا۔

(و) مغل خاندان ________ کی نسل سے تھا۔

۳۔ درج ذیل رموزِ اوقاف کی وضاحت کریں:

رابطہ، تفصیلیہ، قوسین، خط۔

۴۔ اس سبق کا خلاصہ لکھیں۔

۵۔ اپنے کسی قریبی دوست، استاد، عزیز یا رشتے دار کی شخصیت پر ایک مضمون تحریر کریں۔